Vol.4 No.2 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

"مَن چلے کا سودا اور صوفی ازم"

سیدہ طیبہ رباب

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، نڑوالا بنگلہ، ۶۱ ج ب، فیصل آباد

ڈاکٹر روبینہ کوثر

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج فار ویمن عید گاہ روڈ، فیصل آباد

ڈاکٹر عرفان توحید

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

The great Ashfaq Ahmad desired to convey a spiritual message to the people. The short story does not have the ability to convey any strong message. So he selected the Drama for a great purpose and had given it the deep spiritual touch by his rich thoughts of mystical approach especially in "Mann Chaly Ka Souda". It is the story of a person who is spiritually suffering in this society. The common person of our society could not understand him. The dialogues of this Drama have the great sense of the wisdom of the east. It's a special Drama for mystical dimensions. In this article, an endeavour has been made to present the mystical ideas of Ashfaq Ahmed.

Keywords: Creation, Materialism, Soul, Art, Ego, Selfrespect

کلیدی الفاظ: تخلیق، مادیت، روح، فن، انا، عزت نفس

اشفاق احمد قوم کو ایک پیغام دینا چاہتے تھے۔ جب وہ الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہوئے تو ناقدین نے انھیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان پر کئی الزام لگے کہ جیسی حکومت آتی ہے۔ اس کی خوشنودی کی خاطر اسی کے نظریات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ایسی تنقید کرنے والے شاید ادب شناس نہ ہوں جو نہیں جانتے کہ اشفاق احمد جیسا سچا ادیب کسی غیر کی خوشنودی کی خاطر نہیں لکھ سکتا۔ وہ جو کچھ لکھتے اپنے ضمیر کی آواز پر لکھتے رہے۔ پتہ نہیں کچھ لوگوں نے کہاں بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ادب لکیر کا فقیر ہے۔ اس میں جنس اور جذبات سے ہٹ کر کچھ شامل ہو ہی نہیں سکتا۔ ادب سے اصلاح معاشرہ کا کام لینا اتنا گھناؤنا جرم بھی نہیں کہ جس کی پاداش میں ادیب کو اقلیم ادب سے خارج کر دیا جائے۔ اشفاق احمد پر کبھی نام لے کر اور کبھی اشارۃً ایسے الزام لگتے رہے:

> "زمین پر اتر کر کردار کے تمام تر پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کا رجحان ان کہانی کہنے والوں کے ہاں عام ہے۔ جو خواب کار کم اور حقیقت پسند زیادہ ہیں۔ ایسے لوگ بڑے سنجیدہ شہری ہوتے ہیں اور ان کے شعور میں ہمیشہ سوسائٹی کی بے اعتدالیوں یا ناہمواریوں کو طشت از بام کرنے کا رجحان موجود رہتا ہے۔ بعض تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اصلاح کا ایک باقاعدہ پنج سالہ منصوبہ مرتب کرنے لگتے ہیں، مگر ان کا ذکر اس لئے مناسب نہیں کہ وہ ادب کی دنیا کو الوداع کہہ کر اخلاقیات کی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔"(۱)

نقاد نے اشفاق احمد کا نام نہیں لیا لیکن اس الزام کے پس منظر میں اشفاق احمد کا وہ انٹرویو ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے وزیر اعظم سے ملاقات میں کہا:

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

" آپ کے پانچ سالوں کے تمام منصوبے صرف اقتصادیات پر مبنی ہیں۔ کیا آپ ایسی
جرأت کریں گے کہ اگلے پانچ سالوں میں اخلاقیات اور شرافت کا منصوبہ بنائیں تا کہ ہم
اپنا "ٹوٹا ہوا دھاگہ" جوڑ سکیں۔"(۲)

یہ ٹوٹا ہوا دھاگہ تو ہمارے معاشرے کا وہ زمانہ ہے۔ جو داؤ جی جیسے کردار پیدا کرتا تھا۔ جس پر تمام نقاد اختلافات کے باوجود، فریفتہ ہیں۔ اس کی عظمت کو سلام کرتے ہیں اور کلاسیکی ادب میں اس کی اہمیت مسلم ہے لیکن یہی کردار تخلیق کرنے والا اگر معاشرے کو دوبارہ اس روایت سے جوڑنے کی بات کرے جس نے ایسے کردار تشکیل دیے تھے۔ تو اسے اخلاقیات کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ ادب تو زندگی کا عکاس ہے اور زندگی میں روح کا حصہ مادے سے کہیں بڑھ کر ہے اور پھر ایسی تنقید کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ وہ تو اگلے جنم میں بھی اشفاق کا سا مقام و مرتبہ نہیں پا سکتے۔ اشفاق سیاسی سطح پر تو اپنے مشورے پر عمل نہ کروا سکے لیکن ادبی سطح پر وہ انسانیت، محبت، شرافت، روحانیت اور عزت نفس جیسے موضوعات کی ترویج کے لئے افسانے سے ڈرامے کی طرف آ گئے تا کہ اپنے نظریات لوگوں تک پہنچا سکیں۔ یہ ادب کی بڑی خدمت تھی کہ اسے بیمار موضوعات سے نکال کر انسانی کمال کی شاہراہ پر گامزن کر دیا جائے۔ اشفاق کی مخالفت خواص نے کی جنہیں اقلیم ادب میں انقلاب کا خطرہ محسوس ہوا، عوام نے اشفاق کو بڑی محبت دی اور ان کے نظریات کو پسند کیا۔ ڈرامہ ایک ایسی صنف نثر ہے۔ جس کے مخاطب عوام ہوتے ہیں۔ ڈرامہ نگار کے لئے انسانی فطرت کا نباض ہونا ضروری ہے۔ سید وقار عظیم کے خیال میں معاشرے میں مختلف گروہ اور جماعتیں ہوتی ہیں۔ جن کی معاشی، تہذیبی اور ذہنی حالت مختلف ہو سکتی ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ان میں وحدت اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں۔ ڈرامہ نگار کو ناظرین کی ایک مشترک رُوح تلاش کرنا پڑتی ہے۔ یہی روح اس کی مخاطب ہوتی ہے۔ جو افراد کو ایک رشتے میں منسلک کرتی ہے:

" مخاطب کی یہ ذہنی، جذباتی اور روحانی ہم آہنگی، مذاق اور پسند کا یہ گہرا اشتراک اور اس
اشتراک اور ہم آہنگی کی بنا پر ایک ذہنی اور جذباتی رد عمل ہی وہ چیزیں ہیں جو ڈرامے کو
دوسرے فنون سے ممیز اور ممتاز کرتی ہیں۔"(۳)

ان خصوصیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو اشفاق ناظرین کی ایک مشترک روح کو مخاطب کرنے میں کامیاب ہیں۔ دورِ حاضر کا تشنہ لب اور گم گشتہ انسان جس کا تعلق کسی ایک گروہ، فرقے یا مذہب سے نہیں، ان کا مخاطب ہے۔ جو روحانی اقدار کو کھو کر پشیمان اور درماندہ، لب دریائے زیست تڑپ رہا ہے۔ لیکن اسے ایک بوند میسر نہیں بلا تفریق مذہب و ملت یہ ہر انسان کا مسئلہ ہے۔ اشفاق نے اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو بھی "نور والوں" کا رنگ دے کر اپنے ڈراموں میں پیش کر دیا ہے، بعد میں آنے والے بہت سے ڈرامہ نویسوں نے اشفاق کے رنگ میں ڈرامے لکھے ہیں۔ کسی صحافی نے ان سے سوال کیا کہ آپ اپنے کردار سے بہت لمبی تقریر کرواتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ شیکسپیئر کے کردار بھی بہت لمبی گفتگو کرتے ہیں:

"انہوں نے ڈرامہ نویسی میں ابلاغ عام کے حوالوں سے ایسے ایسے ڈرامے تحریر کئے ہیں
کہ جنہیں دنیا کے ہم عصر ڈراموں کے مقابل میں بلا جھجک رکھا جا سکتا ہے۔"(۴)

تاہم ان کے کچھ ڈراموں میں ایک ہی نظریے کی بار بار تکرار سے کبھی اکتاہٹ کا احساس بھی ہوتا ہے۔ تصوف کے حوالے سے "من چلے کا سودا" ان کا شاہکار ڈرامہ ہے۔ اگر اس موضوع پر ان کے دیگر ڈرامے نہ بھی ہوتے تو یہ ایک ڈرامہ ہی کافی تھا اور پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے مشکل موضوع کو نبھاتے ہوئے فن پر آنچ نہیں آنے دی۔ ڈرامہ میں تجسس اور دلچسپی کا عنصر برقرار رہتا ہے۔

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اشفاق احمد ایک طویل عرصے تک من کی دنیا کے مسافر رہے "من چلے کا سودا" انھی طویل مسافتوں کا ثمر ہے۔ ایک سچے ادیب کی پہچان یہ ہے کہ جو کچھ اس کی ذات پر گزرے اسے رقم کرے۔ اپنی زندگی کے مشاہدات، نظریات اور تجربات کو اپنے فکر و وجدان کی مدد سے ادبی پیرائے میں بیان کرے۔ ایک موثر اور لازوال ادب پارہ ایک اچھا اور سچا انسان ہی تخلیق کر سکتا ہے کیونکہ سچ کو زوال نہیں اور کوئی تخلیق فنکار سے الگ نہیں ہوا کرتی بلکہ اس کا شاہکار ہوتی ہے اور اس کی شخصیت ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو اشفاق احمد میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اشفاق احمد نے اردو ادب کے دونوں معروف رویوں سے ہٹ کر اپنی طرز ایجاد کی ہے اور یہ طرز انسان کی وہ بنیادی ضرورت ہے جو روٹی، کپڑا، مکان، جذباتی مسائل اور معاشرتی مسائل سے اہم تر ہے اور وہ ہے انسان کی اپنی تلاش، اس کی اپنی نگہداشت، اس کے باطن کے حالات۔ باطن کے سفر میں اس کا روح سے رابطہ ہے۔ اس سفر کی ابتدا ذات اور انتہا خدا ہے۔ مکان سے لامکان کا سفر، فنا سے بقاء کا سفر۔ عرفانِ ذات دراصل انسان کا ایسا بنیادی مسئلہ ہے کہ اگر وہ اس کا حل دریافت کر لے تو زندگی کے باقی مسائل اسے ہیچ نظر آتے ہیں۔ وہ ان سے بے نیاز ہو جاتا ہے جیسا کہ اقبال نے فرمایا:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی(۵)

"من چلے کا سودا" اشفاق احمد کے ظاہری و باطنی تجربات اور گہرے مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسے طریقہ کار کی وضاحت ہے جس کی مدد سے، بلکہ صرف اسی کی مدد سے، انسان اپنے مقام کو پہچان سکتا ہے اور جب تک وہ اپنے مقام کو پہچان نہ لے اسے حاصل کس طرح کر سکتا ہے، بالخصوص آج کے مادی دور میں جب انسان مادہ پرستی کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے اپنی روح، قلب اور ذہن کا سودا کر کے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ مادی زندگی کے الجھاؤ نے انسان کو اس کے مقام سے گرا کر اس سطح پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ ایک لحظے کے لیے بھی اپنے ضمیر کا سامنا نہیں کر سکتا اور زندگی کے ہنگاموں میں کھو کر اپنے ضمیر کو مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے پاس اپنے لیے وقت نہیں۔ جو انسان اپنے آپ کو ایک لمحہ بھی نہیں دے سکتا وہ دوسروں کو کیا فائدہ پہنچائے گا اور جو نہ خود کو فائدہ پہنچا سکے نہ کسی دوسرے کو، تو اسے ترقی کا دعویٰ کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ جو اندر سے مر چکا ہے وہ جھوٹے قہقہوں کو زندگی کا نام کیوں دے؟ اسی مادی زندگی کے سیلاب پر بند باندھنے کے لیے اشفاق احمد نے اس ڈرامے میں ایسا جامع نظریہ پیش کیا ہے جو انسان کے باطن کو، اس کی روح کو منور کر کے اسے مادیت کے اندھیروں سے نکالتا ہے۔ یہ نظریہ اشفاق احمد کا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ اسلام کا بنیادی نظریہ ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اشفاق صاحب اسے اپنی ذات پر نافذ کر چکے ہیں، اس کے تجربے اور ادراک سے انہوں نے ایک ایسا پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے جو ان کے کمالِ فن کا ثبوت ہے۔

جب انسان کی باطنی اور روحانی ضروریات کا ذکر ہو اور اس نقطۂ نظر سے زندگی کے راستے متعین کیے جائیں، زندگی کے مسائل کو پرکھا جائے تو ترقی پسند طبقہ اسے ایک ایسا نظریہ قرار دیتا ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور جو دنیاوی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ درحقیقت یہ لوگ زندگی کو حیوانی سطح پر یا دوسرے لفظوں میں مادی سطح پر محسوس کرتے ہیں کیونکہ انسان کے باطن کا تعلق تو براہِ راست عملی زندگی سے ہے۔ گھریلو، معاشرتی، انفرادی، ہر سطح پر اس کا باطن اس کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی ذات اس کے افعال سے منعکس ہوتی ہے۔ جس قدر کسی انسان کا باطن پاک ہو گا اسی قدر زندگی میں وہ اپنے فرائض دیانتداری اور خوش اسلوبی سے پورے کر سکے گا۔ اگر اس باطن کی صفائی، پاکیزگی یا باطنی سفر میں کوئی تنہائی کی منزل آجائے تو رہبانیت کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو رہبانیت

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

دراصل مادہ پرستی ہے جو خود غرضی لالچ، ہوس اور ذاتی مفاد کا دوسرا نام ہے۔ مادی دوڑ میں انسان دوسرے کی پروا نہیں کرتا۔ وہ نہیں سوچتا کہ اس کا خود غرضانہ رویہ دوسروں کے لیے کیا دکھ درد اور مسائل کھڑے کر دے گا جب کہ باطن کی پہچان تو خلوص کے بغیر ویسے ہی ناممکن ہے۔ باطن کا سفر تو انسانیت سے محبت کا سفر ہے۔ اس کی عزتِ نفس کا ضامن بن کر اسے عظمتِ آدم سے روشناس کراتا ہے۔ انسان کو اس کا حقیقی مقام صرف روح سے رابطے کی بدولت مل سکتا ہے۔ باطن کو نظر انداز کر کے مادی ترقی تو ایک ایسے اندھے کی دوڑ ہے جسے نہ راستہ دکھائی دیتا نہ منزل۔ ایسی ترقی تو جھوٹی عظمت ہے جس کا مینار ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا بے رحم طوفان ہے کہ جو انسانیت کو بے دردی سے اپنی لپیٹ میں لے کر سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ سو اس طوفان میں اشفاق احمد نے ایک نجات کا راستہ دکھایا ہے۔ وہ باطن کے مسافر کو راہب کہنے والوں کی نہایت خوش اسلوبی سے تردید کرتے ہیں:

> "ارشاد: صرف وہ شخص راہب ہوتا ہے کبیر خان جو سیلفش زندگی بسر کرتا ہے، چاہے وہ زندگی کی بھیڑ میں شامل ہو، چاہے پہاڑ کی چوٹی پر تنہا بیٹھا تپسیا کر رہا ہو۔ یہ دونوں ہی خلق سے دور ہوتے ہیں اور دونوں ہی راہب ہوتے ہیں۔"(۶)

اشفاق احمد یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ انسان کی خلوت اور جلوت ایک ہو یعنی خلوت میں انسانوں سے دور نہ ہو اور جلوت میں کھو کر خود سے دور نہ ہو جائے۔ جس کی یہ کیفیت نہیں وہ راہب ہے۔ جہاں تک مادی ترقی کا تعلق ہے تو اسلام اس سے روکتا نہیں۔ اشفاق صاحب نے اس ڈرامے میں سائنس اور تصوف کے تجربات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سائنس اور تصوف ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جس طرح صوفی اپنے اندر جھانکتا ہے اسی طرح سائنسدان اپنے اندر اتر کر سائنسی ایجادات کے فارمولے تیار کرتا ہے۔ جس طرح سالک کسی راستے یا منزل کی تلاش میں پختہ یقین لے کر آگے بڑھتا ہے اور اس منزل کو پالیتا ہے، اسی طرح سائنسدان بھی اپنے مفروضے پر یقین رکھتا ہے۔ یقین کامل ہی سے وہ فزکس کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کی ایک خود ساختہ تھیوری ہے جو اس کی کامیابی کی ضامن ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک سالک اپنے قلب و وجدان کی رہنمائی میں اپنی ذات سے خدا تک کا سفر کرتا ہے۔ سارے ڈرامے میں اشفاق احمد باطن کے سفر کے ساتھ ساتھ سائنس کی تحقیق کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ سائنس جو کہ عصر حاضر میں ترقی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن آخر میں وہ کامیابی سے ثابت کرتے ہیں کہ آئندہ دور اسلام کا دور ہے جس میں سائنسی تحقیق کی نسبت انسان کی ذات کی تحقیق زیادہ اہمیت کی حامل ہو گی اور آج جو انسان اپنے آپ کو اندرونی طور پر اپنی ذات کی باطنی تحقیق کے لیے تیار کرے گا وہی اس دور میں ترقی کر سکے گا۔ جتنا آج سائنس کا زور، مادے کا زور ہے اتنا ہی آئندہ دور میں روحانیت کا زور ہو گا۔ اشفاق احمد نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ سائنسی تحقیق و ترقی کی، انسان کی باطنی و روحانی تحقیق و ترقی کے بغیر کوئی اہمیت نہیں۔ سائنسی لیبارٹری کو انسانی روح کی لیبارٹری کے لیے گویا علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ڈرامے کا پلاٹ اس کے ہیرو ارشاد احمد کی زندگی کے ارد گرد گھومتا ہے۔ ارشاد کی زندگی کے واقعات ارتقائی شکل میں نہایت خوبصورت لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ ارشاد جو کہ غربت سے امارت کا سفر پہلے ہی طے کر چکا ہے، تین فیکٹریوں کا مالک ہے۔ اندر سے بے چین ہے، کسی راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ ایک ہی جلوے کی تین کرنیں مرشد کے روپ میں اس کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اپنے آپ کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کرنا چاہتا ہے تو اس کے دوست، ماں، دولت، شہرت ایسی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ بظاہر علاج لیکن دراصل کسی روحانی غرض سے لندن چلا جاتا ہے جہاں اس کی مطلقہ بیوی اور دو بچے ہیں۔ اشفاق احمد ٹائم اینڈ سپیس کا نظریہ بھی پیش کرتے ہیں جب ارشاد لندن جا چکا ہے لیکن وہ اس کوٹھی میں بھی موجود ہے جس کا اپنے لیے ایک ویرانے میں انتخاب کر چکا ہے۔ مومنہ ارشاد کی روحانی گفتگو سے تسکین پاتی ہے اس کی تلاش میں اس کوٹھی تک جاتی ہے اندر جھانکتی ہے تو بہت سے کتے ہیں خوف کھاتی ہے کہ محمد حسین ڈاکیا اندر سے نکلتا ہے ارشاد کا

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

پوچھتی ہے وہ اثبات میں جواب دیتا ہے اور کہتا کہ کتوں سے نہ ڈرو مومنہ اندر جاتی ہے محمد حسین کا ایک پاؤں سائیکل پر ہے اور ایک نیچے یہی منظر ساکت ہو جاتا ہے۔ مومنہ کو اندر کتے نہیں بلکہ کبوتر نظر آتے ہیں۔ ارشاد سے تفصیلی گفتگو کرتی ہے۔ ماضی کی تلخیاں جو اس کی اُلجھن کا باعث ہیں۔ ماں اور دوستوں کی بد سلوکی اور شوہر جو اسے بدل دیتا ہے لیکن پسند پھر بھی نہیں کرتا کہ مومنہ کی روح پاک ہے۔ جس کا رُخ بدلنے کی اس کے شوہر میں طاقت نہیں، اسے چھوڑ کے ایک فون آپریٹر لڑکی کے ساتھ دبئی چلا جاتا ہے۔ مومنہ ساری گفتگو کر کے باہر آتی ہے تو محمد حسین اسی ساکت حالت میں ہے پوچھتا ہے کہ ارشاد صاحب ملے مومنہ انکار کرتی ہے کہ اندر تو کوئی بھی نہیں۔ یہاں اشفاق احمد روحانی طاقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو زبان و مکان سے ماوریٰ ہوتی ہے اور ایک ہی انسان ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر پایا جاتا ہے۔ محمد حسین کہتا ہے دعوت نامہ آیا تھا چلے گئے ہوں گے۔

یہ طاقت انسان کو نفسانی خواہشات سے منہ موڑنے پر عنائت ہوتی ہے۔ ارشاد ایک سال بعد واپس لوٹتا ہے تو ماں اور دوستوں سے رسیاں تڑوا کر ایک الگ کوٹھی میں رہائش اختیار کرتا ہے۔ اپنے کام خود کرتا ہے۔ فیکٹریوں کا چارج چھوڑ دیتا ہے۔ اس رہائش میں اشتہاری مجرم ندیم اس کا سفر کاٹنے کے لیے اسے اذیت دیتا ہے لیکن ارشاد روحانی قوت سے اسے بھی راہِ راست پر لے آتا ہے۔ پھر وہ دن آ پہنچتا ہے جب ارشاد صاحبِ ارشاد بن جاتا ہے۔ خدمت خلق کرتا ہے۔ خدا سے وصال کا شوق اس میں موت کی محبت پیدا کر دیتا ہے اور وہ اپنی قوت ارادی کے زور پر جسم کی زنجیروں کو توڑ کے خالقِ حقیقی سے جا ملتا ہے۔

دراصل یہ ڈرامہ اپنے اندر ناولانہ انداز لیے ہوئے ہے اور خالص ادب کی چیز ہے۔ اشفاق احمد نے عوام الناس تک پہنچانے کے لیے اسے ڈرامائی رنگ دے دیا ہے۔ اس میں ایک جامع فلسفہ حیات اور مربوط نظامِ فکر ہے جو انسانی فلاح کا ضامن ہے۔ ڈرامے کا ہیرو ارشاد جو کہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزر چکا ہے اور اب ان میں سے کوئی چیز اس کے سفر میں حائل نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے اضطراب اور بے چینی کو دور کرنے کے لیے اپنے اندر جھانکنا چاہتا ہے۔ اپنے باطن کو، اپنی روح کو جانچنا چاہتا ہے۔ قصے میں ایک ایسا تسلسل اور فطری بہاؤ ہے کہ ارشاد کے باطن کے سفر کے ساتھ ساتھ قاری کا تجسس بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آخر کار ارشاد کی ریاضتِ نفس اس کی چٹھی پر مہر لگوا دیتی ہے اور جب محمد حسین اور ارشاد، بابا غلام دین کے گھر کی طرف جا رہے ہیں، یہ انتہائی متجسس کیفیت ہے۔ نہ جانے کس طرح ارشاد کو شرف قبولیت ملے گا؟ یہ ڈرامے کا کلائمکس ہے۔ اس کے بعد ڈرامہ اختتام کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ جب بابا غلام دین ارشاد کو اپنا جانشین بناتا ہے تو اس وقت یہ تجسس ہے کہ نہ جانے ارشاد کی اب کیا ڈیوٹی ہے۔ لیکن ارشاد کے اندر خدا کے وصل کی آرزو اتنا زور پکڑ لیتی ہے کہ وہ اپنا کام ندیم کے سپرد کر کے اپنی قوتِ ارادی کے زور پر حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

اشفاق احمد نے سائنس کی لیبارٹری میں انسانی روح کے ایٹم کی تشخیص کو بڑے موثر اور دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا فلسفہ حیات اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔ اشفاق احمد کی شخصیت ایسی ہے کہ ان کے نظریے سے اختلاف کرنے والے بھی کم از کم ڈرامائی انداز میں ان کے نظریے کو ضرور پسند کرتے ہیں۔ ان کے نظریات کا ماخذ زندگی کی گہری، تلخ اور سچی حقیقتیں ہیں۔ جو شخص باطن کا سفر کرنا چاہے اور جو اس دنیا میں اس کو ناقابلِ عمل سمجھے، دونوں کے لیے جوابات اس میں موجود ہیں۔

جب ارشاد انتہائی مضطرب ہے اور باطن کا سفر اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کی باطنی حالت کے پیش نظر عبداللہ چرواہا اسے کہتا ہے:

> ”تو کیا جانے معرفت کیا ہے۔ تجھے کسی نے بہکا دیا ہے جوگ کا پہلا قدم تب اٹھے گا جب غصے کو ختم کرے گا۔ غرور، تکبر راکھ بنا کر حکم حکومت داؤ پر لگا دے گا۔ یہ رنگ اتار پھینک پھر جوگ کی سوچنا۔“(۷)

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اس سے محسوس ہوتا ہے کہ باطن کا سفر آسان نہیں اور اس طبقے کے نظریات کی بخوبی تردید ہو جاتی ہے جو روح کے مسافر کو سست اور کاہل سمجھتے ہیں کہ اس سے دنیا کا مقابلہ نہ ہو سکا اس لیے خدا کی طرف چل پڑا۔ چونکہ ڈرامے میں نظریات کی ترسیل کے لیے سارا کام ہی مکالمے سے لیا جاتا ہے اس لیے اس طبقے کی سوچ کی ترجمانی بھی کی گئی ہے:

> "شجاع: معاف کرنا ابراہیم میاں! تمہارے والد ایک بے عمل، سست الوجود، ناکارہ اور کاہل انسان تھے۔ وہ زندگی کو Face کرنے سے گھبراتے تھے اور مسلسل جدوجہد سے کتراتے تھے۔ انہوں نے تین چلتی چلاتی اعلیٰ درجے کی فیکٹریاں، انٹرنیشنل قسم کی، لاکھوں ڈالر کماتی ہوئی، اچانک چھوڑ دیں اور الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔"(۸)

اسی طرح عمران اسے ٹھگو اور مکار شخص قرار دیتا ہے۔ یہ اس طبقے کی جہالت اور کج فہمی ہے جو اپنی خواہشات کا اسیر ہے اور خواہشات کی دوڑ اور تکمیل میں ترقی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے اور خود کو باعمل سمجھتا ہے، اپنی تنگ نظری اور نفس پرستی کا جواز فراہم کرنے کے لیے، جب کہ باطن کے سفر کی تو ابتدا ہی نفی ذات سے ہوتی ہے۔ اشفاق صاحب بار بار اس نقطے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں جیسے محبت میں اپنی Will کو سرنڈر کرنا، قطرے کو سمندر بننے کے لیے خود کو سرنڈر کرنا ضروری ہے۔ ہیر وارشاد اس مقام سے بھی گزر چکا ہے۔ اس حوالے سے مختلف مکالمے دیکھیے کہ خود کو مارنا کیا ہے:

> "لبھا (آواز) جب تک اپنے آپ کو مار نہیں لوگے، ساڑ کے سواہ نہیں کر لوگے، اس کا بھید نہیں ملنا۔ پرانے کو مارنا پڑے گا تے نویں کو جنم دینا پڑے گا۔ پرانا رستہ، پرانی سوچ، پرانا وجود، پرانی آکڑ، پرانی شیخی سب کو ختم کرنا پڑے گا۔"(۹)

ایک لڑکے کا سوال ہے کہ باطن کا راستہ کس طرح ملتا ہے؟ ارشاد کہتا ہے:

> "انا کی مقابلہ بازی ختم کرنے سے ایگو کا کمپیٹیشن ترک کر کے، جب آپ دوسروں کی انا کے ساتھ، ان کی ایگو کے ساتھ اپنی انا اور ایگو کو بھڑانا بند کر دیتے ہیں تو آپ کو باطن کے سفر کا راستہ نظر آنے لگتا ہے۔"(۱۰)

اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ باطن کے سفر میں رکاوٹ معاشرہ نہیں بلکہ انسان کی خواہش کی شدت ہے۔ خواہش کو خدا بنانے والا، نفسِ امارہ کا غلام ہے۔ جن لوگوں کی زیادہ خواہشات پوری ہوتی ہیں وہ زیادہ تند خو ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو دل کے صحن میں اتری ہوئی خواہش کو روٹی کا ٹکڑا ڈال کر الگ ہو جاتے ہیں، وہ شور نہیں مچاتے۔ یہ لوگ صبر کے مقام پر ہوتے ہیں اور صبر کا مقام ہی ایک ایسا گیٹ ہے کہ جہاں پہنچ کر ہر آدمی آزاد ہو جاتا ہے۔ بے صبر انسان اپنی خواہش کی زنجیروں میں بندھا ہوتا ہے۔ یہی زنجیر ہے دراصل جسے وہ معاشرتی مجبوری کا نام دیتا ہے۔ ورنہ جو شخص اپنی خواہش کی زنجیر کو توڑ دے، دنیا کی کوئی قوت اسے قید نہیں کر سکتی۔ معاشرہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ خواہشات کی پیروی اور امیدوں کی فراوانی کا نتیجہ ہے جس نے انسان کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ وہ اپنی پہچان کھو بیٹھا ہے۔ اس باطن اور ظاہر کے شور شرابے میں دل کی آواز دب کے رہ جاتی ہے۔ جب ارشاد کہتا ہے کہ مجھے خدا سے جواب نہیں ملتا، سنائی نہیں دیتا تو محمد حسین اسے جواب دیتا ہے:

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"اوئے صبح صبح تو اخبار پڑھتا ہے۔ پھر ٹیلی فون پر دوستوں سے بحث کرتا ہے۔ محفل میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرے کرنے جاتا ہے۔ پھر ڈش انٹینا پر مسالے دیکھتا ہے۔ شام کو ہیڈ فون لگا کر بی بی سی، ریڈیو جرمنی اور وائس آف امریکہ سنتا ہے۔ اوئے تجھ کو آواز کہاں سے آجاتی ہے۔"(۱۱)

اس بھیڑ میں انسان اس لیے پھنسا ہوا ہے کہ "جہاں مولا نہیں وہاں رولا ہے۔" اس "رولے" میں انسان چاہے کتنا ہی زور لگالے سکون تو "مولا" میں ہی ملے گا۔ اس کے لیے اشفاق صاحب نے سائنس کی مثال بھی دی ہے کہ سائنس کی ایجادات گو انسان کو آرام اور سکون دیتی ہیں لیکن آرام کرنے کے بعد وہ پھر چیخنے چلانے لگ جاتا ہے۔ سکون مادی قوت کے کنٹرول سے نہیں بلکہ روح کے ایٹم کی جانچ سے مل سکتا ہے اس لیے اشفاق احمد کا یقین ہے کہ مستقبل کی سائنس مادے کی نہیں بلکہ انسان کی سائنس ہو گی۔

سائنسی تحقیق طاقت اور اس کے حصول سے وابستہ ہے لیکن مادی طاقت کا حصول انسان کی روح کو دیمک کی طرح چاٹ کر کمزور کر دیتا ہے۔ ہمیں طاقت کا نہیں بلکہ صلح صفائی، امن و سلامتی کا سبق دیا گیا ہے:

"عبداللہ: سُن بابو لوکا ارشاد خوش نصیبا! امن آتشی، صلح صفائی، سلام سلامتی کی لیبارٹری میں کام کرے گا تو روح کے ایٹم کی تحقیق ہو جائے گی۔ انسان سوکھا ہو جائے گا۔ رحمۃ للعالمین کی ٹھنڈی ہوا چلے گی اور ساری دنیا فتح مکہ میں اتر کر سکھ کا سانس لے گی اور اگر ایسا نہ ہوا۔ ایسا نہ ہو سکا تو پھر بے کار ہے۔ بند کر دے یہ لیبارٹری اور واپس چلا جا، موجیں مارنے، جشن منانے۔"(۱۲)

لیکن یہ باطن کا سفر اتنا آسان نہیں۔ قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان آخری سیڑھی سے گر جاتا ہے تو پھر سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ جب ارشاد تزکیہ نفس کی خاطر شرکِ خفی سے گھبراتا ہے تو اسے یہی کہا جاتا ہے کہ ایمان شرک کی بھیڑ بھاڑ میں چلتا ہے اور بنا شرک کے اندھیرے کے ایمان کا نور نظر نہیں آتا۔ اس راستے میں شرط خلوص نیت اور مصمم اِرادہ ہے۔ بزرگانِ دین کی صحبت اور عبادت لیکن عبادت صرف ورد و وظیفہ نہیں بلکہ معمولاتِ زندگی میں حقوق و فرائض کی ادائیگی ہی عبادت بن جاتی ہے۔ جو کسی کا کام ہے اس میں خلوص ہو تو وہی اس کی عبادت ہے۔ یہ ہے بندگانِ خدا کا سفر۔ اب سائنسدان ساری دنیا کو چھوڑ کے اپنی ریسرچ کرتا ہے، لیکن کوئی اسے رہبانیت کا طعنہ نہیں دیتا۔

عبادت کی حقیقت بتانے کے لیے اشفاق احمد نے تحسین بابا کی مثال تفصیل سے پیش کی ہے جو بتیس سال دو مہینے ایک باسن پر نقش و نگار کرتا رہتا ہے۔ اس کی فنی مہارت سے عام لوگ بے خبر ہیں۔ بابا تحسین کسی صاحبِ نظر کا منتظر ہے۔ اس کا باسن ایک نظر کرم کا منتظر ہے، جسے بالآخر فرانس کی ورلڈ آرٹ ایگزی بشن کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں عبداللہ چرواہا کہتا ہے:

"بس عبادت کی اتنی ساری حقیقت ہے بابو لوکا! عبادت کا بھانڈا تیار ہو، سائیں کے کرم کی نظر پڑ جائے تو باگو باگ ہو جاتا ہے، بھانڈا تیار رکھ اور اس کی نظر کی راہ دیکھ۔"(۱۳)

یہاں عبادت کے بھانڈے کی تیاری سے مراد ریاضتِ نفس ہے۔ مہمان کی آمد سے قبل انتظام کی صورت ہے۔ محبوب کے انتظار میں ایک گوشہ خلوت کا سامان ہے۔ دل کے مکان کو گندگی سے پاک اور شور شرابے سے خالی کرنا ہے۔

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

باطن کے سفر میں خارج سے مزاحمت ہوتی ہے اور اندر سے بھی۔ خارجی مزاحمت میں ندیم کی مثال دی گئی ہے جو ارشاد کو تنگ کر تا ہے۔ وارشاد اسے اپناٹسٹ قرار دیتا ہے:

> ''محمد حسین پوسٹ مین صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اللہ کے راستے میں ہر انسان، ہر واقعہ، ہر قسم کے حالات یا تو دین بن جاتے ہیں یا آپ کو دنیا بن جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''(۱۴)

اور ندیم نہ صرف ''دین'' بن جاتا ہے بلکہ ارشاد کے بعد روحانی پیشوا کے فرائض بھی اسی کو انجام دیناہیں۔ لیکن انسان کے اندر کی مزاحمت یا کشمکش اس سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے:

> ''کبھی ٹھنڈے میٹھے پانی کا دریا لہریں مارتا ہے اور کبھی کڑوے زہر کھاری پانی کی طغیانی تلاطم پیدا کرتی ہے۔''(۱۵)

لیکن ان چیزوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ ارادہ نیک ہو تو وہ خود مدد کو پہنچتا ہے جس کی خاطر یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔ گڈریا عبداللہ کا آخری مکالمہ معرفت کا زریں اصول ہے:

> ''سُن بابا لوکا! فقیری ایک بات ہے کان میں کہنے کی، یا تو انسان ادھر تھا یا پھر ادھر ہو گیا گویا کسی نے آگ میں پھونک مار دی۔ نہ اس کے لیے وقت اور زمانہ درکار ہے، نہ عبادت و تسبیح، نہ ورد و وظیفہ، بس چھوٹا سا فیصلہ، ارادہ، منظر بدل جاتا ہے آپی آپ۔''(۱۶)

یہ ہے باطن کا سفر جسے اشفاق احمد نے پوری فنی مہارت سے نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ مذہب اور مادیت کا موازنہ ایسا موضوع ہے جس میں عام طور پر لوگ دلچسپی محسوس نہیں کرتے، لیکن اشفاق صاحب کا پیرائیہ اظہار ایسا ہے کہ ڈرامے میں شروع سے آخر تک دلچسپی اور تجسس قصے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اگر باطن کے سفر میں مشکلات آتی ہیں تو ان کا کوئی ثمر بھی ہے، لیکن مادی زندگی میں مشکلات بھی ہیں، ذلت و خواری، تنگ نظری، ہوس، لالچ، نفرت اور عداوت جیسے تحفے بھی اور لیکن دین میں جبر نہیں۔ اگر کسی کو روح کی پہچان کے لیے خود فریبی سے نکلنا مشکل لگے اور وہ اسے قدامت پرستی اور پس ماندگی کی علامت سمجھے تو یہ اس کے من چلے کا سودا ہے، کھٹالے لے یا میٹھا۔

ڈرامے میں کچھ چھوٹے قصے ہیں جو اصل قصے سے نہایت فطری انداز میں منسلک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً بغداد کے نوجوان کا قصہ جسے اس کے والدین خدا کی راہ میں دے چکے ہیں۔ سلمٰی، عامر اور نائیلہ باسط کی محبت، مومنہ کی کہانی، نور محمد ٹھیکیدار کا قصہ، طلبا و طالبات کے گروپ۔

اشفاق احمد کا موضوع تصوف ہے لیکن زبان اصطلاحی نہیں بلکہ نہایت شستہ و رفتہ ہے۔ مکالمات مختلف نظریات کی وضاحت کرتے ہیں، لیکن گڈریا عبداللہ کے مکالمات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سارے ڈرامے میں توجہ کا مرکز ہیں اور اپنے اندر گہری جاذبیت لیے ہوئے ہیں۔

اشفاق صاحب کا یہ ڈرامہ اپنے نظریات کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کرداروں کے ذریعے مختلف طبقوں کی سوچ کی عکاسی کی گئی ہے۔ شجاع، کبیر، عذرا اور پروفیسر عائشہ کے کردار ماڈرن طبقے کی سطحی سوچ، تنگ نظری اور کج فہمی کے غماز ہیں۔ ارشاد کی ماں ایک روایتی ماں

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہے البتہ نئی جنریشن کے کردار جیسے طلباوطالبات جو ارشاد سے ملنے آتے ہیں اور چوکی بھرتے ہیں، سلمٰی عامر ایسے کردار ہیں جو روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

ڈاکیا محمد حسین، لبھاخاکروب، موچی رمضان اور عبداللہ چرواہا ایسے کردار ہیں جو ایک ہی روشنی کی مختلف کرنیں ہیں۔ یہ باطن کے سفر میں ارشاد کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جو اشفاق احمد کے نظریہ حیات اور ان کی فکر و نظر کے ترجمان ہیں۔

بابا غلام دین کا کردار ایسا ہے جو ظاہری علوم سے یکسر بے بہرہ ہے۔ اس کے باوجود وہ ایسا عارفِ حق ہے، ایسے مقام پر فائز ہے کہ ارشاد جیسا پڑھا لکھا، صاحبِ فکر و نظر جو دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز ہے، اس کی ایک نظرِ کرم کا محتاج ہے۔ بابا غلام دین کی عجز و انکساری اور خلوصِ نیت اسے بلند مقام پر فائز کرتے ہیں۔ اس نے اپنا روحانی ورثہ ارشاد کو منتقل کر دیا ہے۔ محمد حسین ڈاکیا زنجیدہ ہے۔ لیکن ارشاد کی بادشاہی کو تسلیم کرتا ہے اور اسے "اولوالا مرمنکم" مانتا ہے "اطاعت کرو اللہ کی اور رسول ﷺ کی اور جو تم میں صاحب امر ہو۔" اہلِ سنت عموماً اس آیت کی تفسیر میں اولوالامر سے مراد حاکم وقت کو لیتے ہیں لیکن اشفاق احمد نے اولوالامر کو نئے معنی دیے ہیں جو پاک روح انسان ہے اور انسانیت کی رہنمائی اور نجات کا کام کر سکتا ہے اشفاق نے اسے اولوالامر قرار دیا ہے نہ کہ حکمرانوں کو، یہ اشفاق کا فکری اور اجتہادی پہلو ہے۔ اماں طالعاں کا کردار خلوص و محبت کا پیکر ہے۔ سراج کا کردار ایک روایتی مرید کا کردار ہے جو دنیا کی تلاش میں درگاہوں پر پھرتا ہے۔ اسے حق و باطل کی پہچان نہیں۔ آخر ارشاد کی ایک نظر اس کا کام کرتی ہے۔ سراج ایک پیر کے پاس جاتا ہے جو آخر ایک لڑکی کو لے کر بھاگ گیا تھا۔ اس پیر کا کردار درویشی کی عیاری کا غماز ہے۔ بیوقوف عوام دنیاوی خواہشات کو لے کر ان پیروں کے پاس جاتے ہیں تو الٹا نقصان اٹھاتے ہیں۔

ارشاد کے بعد قابلِ ذکر اور دوسرا اہم کردار مومنہ کا ہے۔ یہ ایک الجھی ہوئی لڑکی ہے۔ اسے باطن کا تجربہ نہیں لیکن مذہب کی طرف رجحان ضرور رکھتی ہے۔ مادہ پرستی کا ماحول اسے راس نہیں آتا۔ اس کی سہیلیاں، ماں اور خاوند سب مذہب پرستی کی وجہ سے اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اس کا خاوند اسے چھوڑ کر سعودیہ چلا جاتا ہے۔ وہ ارشاد سے ملتی ہے تو اسے ایک اعتماد سا محسوس ہوتا ہے۔

مومنہ کے ساتھ ارشاد کے آخری مکالمے اشفاق کے نظریات ہیں جن میں وہ کہتی ہے کہ مرد کی محبت اللہ نے اپنے لیے رکھی ہے لیکن عورت مرد سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ ان نظریات کی کوئی بنیاد نہیں اور نہ ہی یہ تاریخ انسانیت سے ثابت ہیں اللہ جیسے مرد کو اپنی طرف بلاتا ہے ایسے ہی عورت پر مہربان ہے اس نے مرد اور عورت میں ایک ہی رُوح پھونکی ہے اور دونوں اپنی اصل سے جدا ہو کر پریشان ہیں۔ وہ عورت سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اس کی کنیز بچے کو زمین پر لٹا کر پانی کی تلاش میں چکر لگاتی ہے تو اس عورت کی سنت کو رہتی انسانیت تک باعثِ تکریم قرار دیتا ہے۔ اس نے عورت کو بڑی عظمت دی ہے۔ اسے اپنی صفت تخلیق میں شریک کیا ہے۔ معاشرتی روایات میں اگر عورت کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ قربِ الٰہی میں بھی مرد سے پیچھے ہے بلکہ یہاں تو انکساری کام آتی ہے جو عورت میں مرد کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اشفاق احمد عورت نہیں ہیں اور نہ انہوں نے خواتین کے مثالی کرداروں پر تفکر کیا ہے۔ جو آسانی سے یہ نظریہ دے گئے کہ اللہ کو مرد سے محبت ہے اور مرد کو عورت سے اور عورت کو بچے سے صوفی ازم کے حوالے سے یہ منفی پروپیگنڈا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں اشفاق نے کوئی استدلال نہیں کیا، ایک خیال ذہن سے گزر جائے تو وہ نظریہ نہیں بن جاتا۔ مومنہ کہتی ہے:

"مرد کو تو خدا سے وصال کا شوق روز ازل سے ہے سر لیکن ہم عورتیں کہاں جائیں۔ ہم
کس دیوار سے سر پھوڑیں اور کس کا سہارا پکڑیں ہم تو یہیں کہیں اسی دنیا میں کسی کے خیال

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

میں کسی کے تصور کے بازوؤں میں دفن ہو جانا چاہتی ہیں اور ہمیں وہ مرقد بھی نصیب نہیں ہوتا۔" (۱۷)

یہ تو عورت کو خدا سے دور کرنے والی بات ہے۔ خدا سے دور ہو کے تو انسان کبھی نجات نہیں پا سکتا عورت جو پہلے ہی ظاہر پرستی اور رسم و رواج کی ماری ہوئی ہے، خواہشات کی اسیر، جذباتی دنیا میں رہنے والی رومانوی مخلوق ہے، اپنے من میں اترنے کی کوشش ہی نہیں کرتی اشفاق احمد اس کو مزید اندھیروں میں دھکیل کر زیادتی کر رہے ہیں۔ روحانی پاکیزگی، نیک نیتی اور ریاضت کی مرہون منت ہے اس میں جنسی تفریق نہیں۔

مومنہ ڈرامے کی ہیروئن ہے اور ارشاد کی محبت میں گرفتار ہے۔ لیکن آخر تک اس محبت کا اظہار نہیں کرتی۔ ارشاد اس کی محبت کو محسوس کرتا ہے۔ جب وہ بستر مرگ پر ہے، مومنہ اسے زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن ارشاد موت میں ایک لذت محسوس کر رہا ہے۔ اسے اپنا مادی وجود ایک بوجھ، ایک رکاوٹ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ ایک روحانی کیف محسوس کر رہا ہے کہ اس کے اعضائے بدن محبوب پر نثار ہو رہے ہیں۔ اس کی حمد و ثنا کر رہے ہیں۔ وہ اسے ایک بے حد خوشگوار اور ایڈونچرس سفر قرار دیتا ہے۔ لیکن مومنہ ابھی اس مقام سے نا آشنا ہے۔ وہ ارشاد کو بچانا چاہتی ہے۔ اس موقع پر وہ اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیتی ہے، لیکن غیر جذباتی انداز میں:

"(بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ لیکن جذباتی ہوئے بغیر) "آپ کو پتہ ہے سر پتہ ہے
میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"
ارشاد: "میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں مومنہ! جو تم ہو اس وجہ سے بھی اور جو کچھ تم
آگے چل کر ہونے والی ہو، اس وجہ سے بھی۔" (۱۸)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ارشاد کی محبت مومنہ کی الجھنوں کو دور کر دے گی اور وہ بھی روحانی سلسلے کی کڑی بن جائے گی۔ ارشاد وصل سے ہم کنار ہو چکا ہے اور مومنہ ساکت و صامت پتھر کی مورت بنی کھڑی ہے۔ لیکن محبت اتنی کمزور نہیں ہوتی۔ موت سے فنا نہیں ہوتی۔ مومنہ ضرور یہ سفر کرے گی جس میں منزلیں ہی منزلیں ہیں۔ وسعت ہے، گہرائی ہے، جاذبیت ہے۔ وہ ہر قدم پر ارشاد کو اپنے ساتھ پائے گی۔ اشفاق احمد کے نظریات ایک ایسے عارفِ حق کے تجربات کا نچوڑ ہیں جو اس زندگی میں عرفان کی منزلیں طے کرتا ہے اور موت کے بعد بھی یہ سفر جاری رہتا ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ ع: اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے!

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، افسانے کا فن، مشمولہ: اردو افسانہ روایت اور مسائل، پروفیسر گوپی چند نارنگ، (مرتبہ)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۵
۲۔ محمد نواز کھرل (مرتب)، باتوں سے خوشبو آئے، لاہور: زاویہ پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳۱
۳۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم، اردو ڈراما فن اور منزلیں، لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۹۳۔۱۹۹۲ء، ص ۵۸
۴۔ فرزانہ سید، نقوشِ ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۴۶۳
۵۔ اقبال، بالِ جبریل، لاہور: غلام علی پبلشرز، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۵
۶۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۹
۷۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۱۳

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.2 2021

۸۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۳۱۱
۹۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۱۴۲
۱۰۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۲۶۳
۱۱۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۲۳۵
۱۲۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۲۰۴
۱۳۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۷۹
۱۴۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۲۱۲
۱۵۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۳۱۹
۱۶۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۳۱۹
۱۷۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۳۰۵
۱۸۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، ص ۳۰۴

ماخذ:

۱۔ وزیر آغا،افسانے کا فن،مشمولہ: اردوافسانہ روایت اور مسائل، پروفیسر گوپی چند نارنگ،(مرتبہ)،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۶ء
۲۔ محمد نواز کھرل(مرتب)،باتوں سے خوشبو آئے،لاہور:زاویہ پبلشرز،۲۰۱۲ء
۳۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم،اردو ڈرامافن اور منزلیں،لاہور:زاہد بشیر پرنٹرز،۹۳۔۱۹۹۲ء
۴۔ فرزانہ سید، نقوشِ ادب،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء
۵۔ اقبال،بالِ جبریل،لاہور:غلام علی پبلشرز،۱۹۸۵ء
۶۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء